نصب العین کی طرح انسان کو اس کے فطری مقصود کی طرف بڑھنے نہیں دیتا لہٰذا غلط نصب العین کا معتقد بھی فرضی نصب العین کے پرستار کی طرح ایک بیکار مشغلہ یا کھیل میں مصروف رہتا ہے۔ اگر ایسے شخص کو اس دنیا کی زندگی میں سفلی خواہشات کی بے لگام تشفی کی وجہ سے ایک گونہ عارضی مسرت یا راحت نصیب ہو جائے تو اس پر اترانے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس کا انجام خدا کا وہ عذاب ہوتا ہے جو انسان کو اپنے فطری تقاضوں کو روکنے، دبانے یا نظر انداز کرنے کی وجہ سے جھیلنا پڑتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غلط نصب العینوں کی پیروی کرنے والوں کے متعلق قرآن حکیم کا ارشاد یہ ہے کہ ان کا دین لہو و لعب ہے کیونکہ ان کا نصب العین دنیاوی زندگی کا تعیش ہے خدا نہیں۔

وَذَرِ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَعِبًا وَّلَهْوًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌ بِمَا كَسَبَتْ (الانعام: ۷۰)

اور جن لوگوں نے کھیل اور تماشا کو اپنا دین بنا رکھا ہے اور دنیا کی زندگی نے اُن کو دھوکہ میں ڈال دیا ہے، اُن سے کوئی سروکار نہ رکھیے اور قرآن سے ان کو نصیحت کرتے رہیئے تا کہ ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن کوئی جان اپنے کیے کی وجہ سے ہلاک ہو

لعب اور تخلیق میں دُوسرا فرق

کھیل اور سنجیدہ عمل میں دوسرا فرق یہ ہے کہ کھیل کے نتیجہ کے طور پر فریقین میں سے کوئی بھی ہار سکتا ہے اور پھر اس میں نہ ہارنے کی کوئی اصلی اور حقیقی سزا ہے اور نہ جیتنے کا کوئی اصلی اور حقیقی انعام ہے اگر کوئی سزا یا انعام ہے تو وہ بھی نقلی اور بناوٹی ہے اور کھیل ہی کا ایک حصہ ہے اس کے برعکس سنجیدہ عمل کے نتیجہ کے طور پر ہمیشہ ایک فریق کی فتح ہوتی ہے اور وہ اہل حق کا گروہ ہوتا ہے اور ہمیشہ دوسرے فریق کی ناکامی اور رسوائی ہوتی ہے اور وہ اہل باطل کا گروہ ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر خدا نے کوئی کھیل کھیلنا ہوتا تو وہ اس کائنات کی صورت میں نہ ہوتا جو حق و باطل کی رزمگاہ ہے اور جس میں حق ہمیشہ باطل کا سر کچل دیتا ہے، باطل ہمیشہ حق سے مار کھاتا ہے اور جو اس بنا پر کھیل کے ہر وصف سے خالی ہے بلکہ خدا کا کھیل کہیں اس کی اپنی فرشتوں کی مجلس میں قائم ہوتا جہاں باطل نہ موجود ہوتا نہ کچلا جاتا۔ لیکن اس کائنات میں باطل کا

© rasailojaraid.com

جو انجام ہونے والا ہے اس کے پیش نظر انسان کے لیے ضروری ہے کہ اس سے علاقہ نہ رکھے۔ لیکن افسوس ہے کہ منکرین خدا سے انکار کا راستہ اختیار کر کے باطل سے وابستہ ہو چکے ہیں اور باطل کے انجام سے بے خبر ہیں۔ اس مضمون کو قرآن حکیم نے یوں بیان فرمایا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○
لَوْ اَرَدْنَآ اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّآ اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ○
بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهٗ فَاِذَا هُوَ
زَاهِقٌ وَلَكُمُ الْوَيْلُ مِمَّا تَصِفُوْنَ ○ (الانبیاء:۱۶)

(اور ہم نے آسمان اور زمین اور ان کی درمیانی مخلوقات کو بطور ایک کھیل کے نہیں بنایا اور اگر ہم کوئی کھیل قائم کرنا چاہتے تو اپنے قریب کی فرشتوں کی مجلس میں قائم کر لیتے بشرطیکہ ہم یہ چاہتے بلکہ یہ کائنات حق و باطل کا میدان کارزار ہے جہاں ہم حق کو باطل پر دے مارتے ہیں اور حق باطل کا سر کچل دیتا ہے یہاں تک کہ وہ مٹ جاتا ہے جو کچھ تم کہتے ہو اس کے لیے تم پر افسوس ہے)

تخلیق بالحق کے مضمرات

اگر کائنات ایک کھیل کے طور پر بنتی تو اس کے لاتعداد نصب العین ممکن تھے۔ کیونکہ فرضی اور بناوٹی نصب العینوں کی کوئی حد نہیں ہو سکتی لیکن سچا نصب العین جس کا تقاضا خودی کی فطرت میں مضمر ہے فقط ایک ہی ہو سکتا ہے جب نصب العین خودی کی فطرت کے مطابق ہو یعنی حق ہو تو جو وجود نصب العین بنتا ہے وہ بھی حق ہوتا ہے اور حق کی خوبیوں اور قوتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے لہٰذا اس وجود کو جہاں تک ممکن ہو خود بھی اپنی نصب العینی صورت کی جانب بدلنا اور ڈھلنا پڑتا ہے اور اس غرض کے لیے ہر قسم کی رکاوٹوں اور مشکلوں کا سامنا کر کے ان کو راستے سے ہٹانا پڑتا ہے اگر وہ وجود اپنی نصب العینی صورت میں نہ ڈھل سکے اور رکاوٹوں اور مشکلوں کے ساتھ تعاون کرے تو خدا کا جلال اس کو ان رکاوٹوں اور مشکلوں کے سمیت برباد کر کے خدا کے سچے نصب العین کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے اسی بنا پر قرآن حکیم نے بھی یہ دعا سکھائی ہے۔

com

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ (آل عمران : ۱۹۱)

ترجمہ: اے ہمارے پروردگار تو نے یہ کائنات (با حق پیدا کی ہے) باطل پیدا نہیں کی تو سب عیبوں سے پاک ہے لہٰذا (اگر ہم کائنات کے سچے نصب العین کے مطابق خود ڈھل نہ سکیں تو ہماری مدد فرمایئے اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا لیجئے۔

مختصر یہ کہ ہر وہ چیز جو خدا کی صفات جمال و جلال کے عمل اور اظہار کی (یا دوسرے لفظوں میں خدا کے نصب العین کی) ممد و معاون ہے حق ہے اور ہر وہ چیز جو خدا کی صفات جمال و جلال کے عمل و اظہار کی (یا خدا کے نصب العین کی) ممد و معاون نہیں باطل ہے۔

قائماً بالقسط کا مطلب

خدا کا نصب العین جو برحق ہے خدا کی صفات برحق کا تقاضا ہے اور خدا کی صفات کے اظہار سے ہی عالم وجود میں آسکتا ہے۔ لہٰذا اس کی تخلیق اور تکمیل ان خاص قوانین اور ضوابط کے ماتحت ہوتی ہے جو خدا کی صفات کے اندر بالقوہ موجود ہیں اور اس کے نصب العین کے مطابق ہیں۔ کائنات اپنی سطح پر خواہ وہ مادی ہو یا حیوانی یا انسانی خدا کے حکم سے ان قوانین و ضوابط پر چلنے کے لیے مجبور ہے۔ ان ہی قوانین و ضوابط کو قرآن مجید نے قسط (عدل) کہا ہے جس کو خدا نے اپنی کائنات میں قائم کر رکھا ہے اسی لیے خدا قائماً بالقسط ہے۔ کائنات اپنے اندرونی ضبط اور نظم کے ساتھ اس لیے موجود اور قائم ہے کہ وہ ایک خاص نصب العین کی سمت میں جو حق ہے اور جس کا پالینا اس کے لیے ضروری ہے آگے بڑھ رہی ہے۔ بسا اوقات انسان چاہتا ہے کہ حق کے مقتضیات سے بے پرواہ ہو کر اپنی خواہشات کی تکمیل کرے اور اس کی خواہشات حق کے تابع نہ ہوں بلکہ حق اس کی خواہشات کے تابع ہو جائے لیکن ایسا نہیں ہوسکتا۔ حق تابع نہیں بلکہ متبوع ہے اگر ایسا ہوسکتا تو کائنات کا سارا نظام درہم برہم ہو جاتا کیونکہ یہ نظام اپنے مقصد یا نصب العین پر قائم ہے اور اس صورت میں کائنات کا کوئی مقصد یا نصب العین باقی نہ رہ سکتا۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ۔ (المومنون : ۷۱)

اور اگر حق ان کے تابع ہو جائے تو آسمان اور زمین میں اور جو مخلوقات ان کے درمیان ہیں

© rasailojaraid.c

رہی ہے ان میں فساد برپا ہو جاتے۔

یہی مطلب ہے قرآن حکیم کے اس ارشاد کا کہ زمین وآسمان کی تمام مخلوقات خدا کے تابع فرمان ہیں۔

لَہٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔ (آل عمران: ۸۳)

آسمان اور زمین کی تمام مخلوقات خدا کے سامنے سر تسلیم خم کیے ہوئے ہیں۔

تمام قوتیں جو کائنات کے نصب العین کی مخالف ہیں اور لہٰذا حق نہیں بلکہ باطل ہیں ان قوتوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکتیں جو کائنات کے نصب العین کی معاون ہیں اور لہٰذا باطل نہیں بلکہ حق ہیں قرآن حکیم کی تعلیم وہ قوت ہے جو حق ہے اس کے ظہور کے بعد آخر کار تمام باطل تعلیمات کا مٹ جانا ضروری ہے۔

قُلۡ جَآءَ الۡحَقُّ وَزَهَقَ الۡبَاطِلُ اِنَّ الۡبَاطِلَ کَانَ زَهُوۡقًا (بنی اسرائیل: ۸۱)

کہہ دیجیے کہ وہ تعلیم جو حق تھی آگئی اور وہ تعلیمات جو باطل تھیں مٹ گئیں بیشک باطل اپنی فطرت کی وجہ سے مٹ جانے والا ہے

(جاری ہے)

بقیہ : تحفظِ اجناسِ خوردنی

میں جگہ جگہ حکمت کے موتی جڑ دیئے گئے ہیں لیکن اس کی مثال ایک بحرِ ذخار کی سی ہے کہ جس کی گہرائیوں تک پہنچنا ناممکن ہے۔ آپ دیکھئے کہ چودہ سو برس سے علماء ومفسرین اس اتھاہ سمندر میں غواصی کر رہے ہیں۔ ایک مفسر کے ہاتھ ایک نکتہ آجاتا ہے تو وہ اسے ہی انمول جوہر سمجھتا ہے۔ اس کے بعد دوسرا اسی سے کوئی گوہر نایاب تلاش کر لیتا ہے اور فخر سے پھولا نہیں سماتا، صدیوں سے یہی احوال ہے اور آج بھی یہی کیفیت ہے۔

ذٰلِکَ فَضۡلُ اللّٰہِ یُؤۡتِیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَاللّٰہُ وَاسِعٌ عَلِیۡمٌ

●

.com

سید شبیر حسین شاہ زاھد

قرآن مجید اور مستشرقین

قرآن مجید جو کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہونے والا آخری آسمانی صحیفہ ہے" جو اپنے سے پہلے صحیفوں کا مصدّق اور مہیمن ہے۔ یہ ایسی آسمانی کتاب ہے جس کا حرف حرف اور لفظ لفظ اپنے اندر معانی کا سمندر ِ گہربار رکھتا ہے۔ یہی وہ کتاب ہے جس کا قیامت تک نافذ العمل رہنا مقدّر ہو چکا ہے اور یہی وہ آسمانی ہدایت ہے جس پر عمل کرنا پیرو کارانِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے لازم ہو چکا ہے۔

مستشرقین وہ غیر مسلم "علماء" ہیں، جنہوں نے اسلام پر تحقیق کر کے اپنی ایک حیثیت متعین کی ہے۔ ان کی تحقیق کے بظاہر دو مقصد تھے۔ اسلام کو اپنے ہم مذہبوں کے سامنے پیش کرنا اور اپنے آپ کو دین (اسلام) کے طالب علم ظاہر کرنا۔ لیکن ان لوگوں کا اصل مقصد اسلام میں کیڑے نکالنا ہوتا تھا اور ہے۔ نہ صرف یہ کہ غلط فہمی اور کم علمی کی بناء پر اسلام کے بارے میں بدظنی کرتے ہیں بلکہ اسلام کو مسخ کر کے لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ اس تمام تحقیق کی پشت پر جو ذہن کام کرتا ہے وہ اسلام دشمن ہوتا ہے، سوائے چند ایک مستشرقین کے جنہوں نے اسلام کی صداقتوں کو نہ صرف تسلیم کیا بلکہ اسلام کے اصولوں سے متأثر ہو کر دائرہ اسلام میں داخل ہونے کی سعادت بھی حاصل کی۔

نولڈیکے ایک جرمن مستشرق تھا۔ جس نے ۱۸۵۹ء میں قرآن مجید پر ایک مقالہ لکھا۔ جس کو اس نے نظر ثانی اور چند اضافوں کے ساتھ ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا جس کا نام GESCHICHTE DES QORAN (تاریخ قرآن) رکھا۔ ولم میور نے جب قرآن مجید پر کتاب لکھی، تو زیادہ تر اسی نولڈیکے کے اعتراضات پیش کئے تھے۔ جن کا حتمی جواب تو سرسید

© rasailojaraid.com

احمد خاں نے "خطبات احمدیہ" میں دے دیا تھا۔ مگر ذیل کے چند اعتراضات کا جواب تا حال نہیں دیا جاسکا۔

اِ۔ نولڈیکے کہتا ہے کہ "قرآن مجید میں بعض ایسی فاش تاریخی غلطیاں ہیں۔ جن سے اس کے مصنف کی (نعوذ باللہ) جہالت عیاں ہے مثلاً (۱) سورۃ قصص میں ہامان کو فرعون کا وزیر بنادیا۔ حالانکہ ہامان شاہ کیخسرو ایرانی کاوزیر تھا۔ جس کا ذکر توریت کی کتاب "ایستر" میں ہے۔ شاہ کے خسرو ایرانی فرعونِ مصر کے سینکڑوں برس بعد گزرا ہے۔ (۲) سورۃ مریم میں مریم کو ہارون کی بہن لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ہارون (حضرت مریمؑ سے) سینکڑوں برس پہلے وفات پاچکے تھے (۳) سورۃ مائدہ میں مسیح پر نزول مائدہ کی کیفیت رسمِ "عشاءِ ربّانی" کی ایک خلاف واقعہ اور مضحکہ خیز تصویر ہے۔"

(۱) حضرت موسیٰؑ جس فرعون کے زمانے میں مبعوث ہوئے وہ قدیم مصریوں کی انیسویں سلطنت کا بادشاہ رعمسیس ثانی تھا۔ اور جس کے دور میں آپ نے مصریوں (یہودیوں) کی حمایت میں حکمرانِ مصر کے خلاف علم جہاد بلند کیا وہ "منفتاح" اول تھا۔ اسی کی لاش آج تک اللہ نے محفوظ رکھی ہوئی ہے۔ فراعنۂ مصر نے اپنے دور میں مصر میں عالیشان عمارتیں اور بت خانے تعمیر کروائے۔ اس زمانہ کے مندروں کے کاہن اور بتخانوں کے پجاری دولت اور طاقت کے لحاظ سے سلطنت کا ایک قوی بازو سمجھے جاتے تھے۔ ان سب معبدوں میں مینڈھے کی شکل کے دیوتا "آمن" کا مندر بہت وقیع مانا جاتا تھا اور اس کے کاہنوں کے اختیارات بہت وسیع تھے۔ سردار کاہن کو بنی اول کہتے تھے۔ محکمہ تعمیرات کا افسر بھی یہی تھا اور مندروں کی عمارتوں کی تعمیر و زینت کا کام بھی اسی کے سپرد تھا۔ دیوتا کی فوج یعنی مندر کے سپاہیوں کا جنرل بھی یہی ہوا کرتا تھا۔ خزانہ کی نگرانی اور انتظام بھی اسی کے ہاتھ میں تھا۔ نہ صرف "آمن" کا مندر اور اس کے پجاری اس کے دائرہ حکومت میں تھے۔ بلکہ تھیبس اور شمالی و جنوبی مصر کے تمام دیوتاؤں کے پجاریوں کا افسر اعلیٰ یہی تھا۔ مندروں کے خدمت گار عموماً قیدیانِ جنگ ہوتے تھے۔ لیکن کاشتکار اور اہلِ حرفہ بھی قیدیوں میں شامل کر لئے جاتے تھے۔ یہ لوگ کھیتوں میں کام کرتے، گلوں کی نگہبانی کرتے، مندروں کی تعمیر میں اُن سے جبریہ خدمت لی جاتی اور اکثر سے سونا، چاندی اور دوسری

.com

قدرتی پیداواریں بطور پیشکش وصول کی جاتیں۔ اندازہ ہے کہ صرف شہر تھیبس کے دیوتا "آمن" کے مندر کے قبضہ میں مصر کی زمین کا دسواں حصہ تھا اور کم از کم ۱/۵۰ آبادی پر اس کی حکومت تھی (دیکھو جیوش انسائیکلوپیڈیا جلد دھم و قدیم مصریوں کا مذہب از ڈاکٹر اسٹنڈ روف) اب دیکھو قرآن مجید فرعون وہامان کے بارے میں کیا کہتا ہے۔ اِنَّ فِرْعَوْنَ وَ هَامَانَ وَ جُنُوْدَهُمَا كَانُوْا خٰطِئِيْنَ (بے شک فرعون اور ہامان اور ان کے لشکر والے قصوروار تھے[1]) یہاں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فرعون مصر کا بادشاہ ضرور تھا لیکن "آمن" کا سردار کاہن اور اس کے ساتھی بطور خود ایک طاقت تھے اسی لئے "جنودھما" کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اب قرآن میں یوں ارشاد ہوتا ہے۔ "اور فرعون نے کہا درباریو! معلوم نہیں میرے سوا تمہارا کوئی خدا ہو۔ پس ہامان تو میرے لئے مٹی پکوا۔ اور ایک محل میرے لئے بنوا تو شاید (میں) موسیٰ کے خدا کو جھانک لوں اور میں تو سمجھتا ہوں کہ وہ (یعنی حضرت موسیٰؑ) جھوٹا ہے[2]"۔

یہ تذکرہ اوپر ہو چکا ہے کہ دیوتا "آمن" کا سردار کاہن میر عمارت بھی ہوتا تھا۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے اب رہ گیا یہ سوال کہ "آمن" کے سردار کاہن کو قرآن نے ہامان کیوں کہا تو اس کا جواب یہ ہے کہ توریت میں حضرت موسیٰؑ کے بھائی کا نام ارون لکھا ہے اور وہ بنی اسرائیل کے سردار کاہن تھے۔ لیکن قرآن مجید نے ان کو ہارون کہا۔ اسی قبیل سے آمن کے سردار کاہن کو ہامان کہہ دیا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ عبرانی کا آمن (دیوتا) معرّب ہو کر ہامان بن گیا ہو اور قرآن نے آمن کو ہامان کے نام سے یاد کیا ہو۔ لیکن آمن سے مراد آمن کا سردار کاہن مراد ہو۔

میونخ (جرمنی) میں مصر کا ایک قدیم مجسمہ موجود ہے، جس پر تحریر ہے کہ یہ مجسمہ آمن کے سردار کاہن بکن خونس کا ہے جو رعمسیس ثانی کے زمانہ میں تھا۔ نیچے مجسمہ کی خود نوشت ہے کہ بچپن سے کیوں کر درجہ بدرجہ اس نے ترقی کی اور انسٹھ (۵۹) برس کی عمر میں آمن کا سردار کاہن مقرر ہوا۔ بے شک یہ بکن خونس (مصری زبان کا لفظ) وہی

---

۱ القصص: ۸   ۲ القصص: ۳۸

© rasailojaraid.com

شخص ہے جس کو آمن کے سردار کاہن کی مناسبت سے قرآن نے ھامٰن کہا ہے۔ ہمارے مفسرین نے اس کو فرعون کا وزیر لکھ دیا لیکن ثبوت کوئی نہ تھا۔ اس لئے مخالفین اعتراض کرنے لگے۔ لیکن جدید تحقیقات نے اس کی تائید کر دی کہ

"آمن کا سردار کاہن منجملہ دیگر اختیارات کے جنوبی مصر کا وزیر بھی مقرر ہوتا تھا"۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا جلد نہم ۵۴)

ب..... پادری سیل نے، جو نولڈیکے سے ڈیڑھ سو سال پہلے ہو گزرا ہے۔ "اختِ ہارون" والے اعتراض کو نقل کر کے خود ہی اس کو رّد بھی کیا ہے کہ

"اگرچہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) قدیم تاریخ اور علم انساب سے ایسے ناواقف خیال کیے جا سکتے ہیں جس سے ایسی فاش غلطی (کہ مریم کو ہارون کی بہن لکھ دیا) سرزد ہو گئی ہو۔ لیکن میں نہیں سمجھتا کہ قرآن کے الفاظ سے یہ نتیجہ کیسے نکل سکتا ہے۔ مثلاً اگر دو شخصوں کے ایک ہی نام ہوں اور ان کے والدین کے نام بھی ایک ہی ہوں تو اُن کو فرد واحد کیوں کر سمجھ سکتے ہیں۔ علاوہ اس کے ایسی غلطی قرآن کے اُن دوسرے مقامات سے باطل ہو جاتی ہے۔ جہاں یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ محمدؐ کو معلوم تھا اور انہوں نے اس کا اظہار بھی کیا کہ عیسیٰؑ کا زمانہ موسیٰؑ سے صدیوں بعد میں ہے۔ (دیکھئے ترجمہ قرآن سورۃ آل عمران و سورۃ مریم) مریم کو ہارون کی بہن (قرآن نے) اس لئے کہا کہ وہ قبیلہ لوئی سے تھیں (جیسا کہ ایشبیع کے رشتہ دار ہونے سے معلوم ہوتا ہے) یا پھر بطور تشبیہ بیان کیا ہے"۔

بیشک اگر قرآن کے الفاظ اور اسلوب بیان پر غور کیا جائے تو مطلب صاف ہے کہ یہ بیان تشبیہ کے طور پر تھا۔ مثلاً سورۃ طٰہٰ میں گوسالہ پرستی کے معاملے میں جب حضرت موسیٰؑ غیظ و غضب میں حضرت ہارونؑ کے سر اور داڑھی کے بال کھینچتے ہیں تو آپ ان کے غصّہ کو دھیما کرنے اور محبت کو جوش دلانے میں یوں خطاب کرتے ہیں۔ یَا بْنَ اُمَّ لَا تَأْخُذْ بِلِحْيَتِي وَلَا بِرَأْسِي[1]۔ اب یہاں یَابْنَ اُمَّ سے یہ مراد نہیں ہے کہ حضرت موسیٰؑ حضرت ہارونؑ کے سوتیلے بھائی تھے۔ اسی طرح یہاں اُختَ ہارُون (سورۃ مریم میں) کہہ

---

[1] طٰہٰ : ۹۴

دینے کا یہ مطلب نہیں کہ واقعی حضرت مریم حضرت ہارون کی سگی بہن ہی ہیں۔ حضرت ہارونؑ اور آپ کی نسل معبد کی خدمت کے لئے مخصوص تھی۔ حضرت مریم آپ کی نسل سے تھیں اور معبد کی نذر کی گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہودیوں کے استعجاب اور غیرت دلانے والے انداز کو "یٰاُخْتَ ہٰرُوْنَ" کہہ کر بیان کیا گیا ہو۔[۱]

(۳) عیسائیوں کی رسم عشاءِ ربّانی (یوکیرسٹ) کا تعارف یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ توکّل کو رفیق رکھتے تھے اور اپنے حواریوں اور پیرو کاروں کو بھی یہی توکّل اور تواضع کی تعلیم تھی۔ یوکیرسٹ کے لفظی معنی بھی شکر گزاری کے ہیں۔ اس لئے کہ متوکّل انسان شکر گزار پہلے ہوتا ہے۔ اسی مناسبت سے یہ لفظ (یوکیرسٹ) پہلے پہل آپ کے لئے استعمال ہوا۔ اپنی گرفتاری سے ایک دن پہلے بھی آپ نے ایک شب اپنے حواریوں کے ساتھ مل کر روٹی کھائی۔ شکر خدا بجالائے اور اُن کو برکت دی۔ سینٹ پال' جس نے ابن اللہ کا نظریہ اختراع کیا' نے آپ کی اس نیک سیرت کو ایک پراسرار رسم کی شکل میں بیان کیا اور اس روٹی والے واقعہ کو "کفّارہ" پر منطبق کر دیا۔ (دیکھئے نامہ اول کارتھیاں (۱۱/۲۳-۲۵) پال کے اس نظریہ کو مرقس نے (۱۵/۲۲-۵۲) متی نے (۲۶/۲۶-۲۹) اور لوقا نے (۲۲/۱۴-۲۰) اپنی اناجیل میں شامل کر لیا۔ لیکن یوحنا نے اس رسم کا ذکر نہیں کیا۔ بلکہ کہتا ہے کہ (آخر شب) مسیح نے حواریوں کے پاؤں دھلائے اور فرمایا کہ اسی طرح تم بھی خدمت کرو تاکہ مخدوم بنو (۱۳/۱-۱۰) پھر روٹی اور پیالہ سے مراد "آپؑ کی تعلیمات" قرار دیا ہے (۶/۵۱)

یہ خیالات یہودی فلسفی فائلو' جو کہ حضرت عیسیٰؑ کا ہم عصر تھا کی تعلیمات متعلقہ لوگاس (کلمۃ اللہ) کا آئینہ ہیں۔ اس نے بھی لوگاس کو مائدۂ آسمانی اور ساقی یزدانی قرار دیا تھا۔ بہرحال! حضرت عیسیٰؑ کے بعد سے آپ کی آخرِ شب والی رسم کو "پراسرار رسم" کے طور پر مروّج کر دیا گیا۔ جس میں رومی بت پرستوں کی رسم "اسرار مترا" کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ یہ ہے رسم "عشاء ربانی" جو سینٹ پال کی تخلیق کردہ ہے اور جو ابن اللہ اور کفارہ کے نظریہ کو تقویت دینے کو گھڑی گئی ہے۔

---

[۱] مریم : ۲۸

© rasailojaraid.com

قرآن مجید میں یہ رسم مذکور نہیں سورۃ مائدہ میں صرف اسی قدر مذکور ہے۔ ”جب حواریوں نے کہااے عیسٰیؑ ابن مریم کیا تیرارب قدرت رکھتاہے کہ ہم پر آسمان سے مائدہ اتارے؟ کہااگر تم ایماندار ہو تواللہ سے ڈرو۔ حواری بولے کہ ہم اس (مائدہ) میں سے کھاناچاہتے ہیں۔ (تاکہ) ہمارے دل مطمئن ہوں۔ کہ معلوم کرلیں کہ تونے سچ کہااور ہم اس پر گواہ ہوجائیں۔ عیسٰیؑ ابن مریم نے کہاخداوندہم پر آسمان سے مائدہ نازل کر کہ ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہواور تیری نشانی (بھی) اور ہمیں رزق دے اور تو (ہی) بہترین ہے رزق دینے والوں میں سے۔ خدانے کہامیں اس (مائدہ) کااتارنے والا ہوں پھر تم میں سے جو کفر کرے گامائدہ کے اترنے کے بعد' میں اس کووہ عذاب دوں گا کہ کسی کوعالم میں نہ دیاہو“۔ (المائدہ۱۱۱تا۱۱۵)

حواریوں نے درویشانہ اور متوکل زندگی کے باوجود جب یہ الفاظ حضرت عیسٰیؑ سے کہے تو آپ نے ان کوادب سکھانے کے لئے کہاکہ ”خداسے ڈرو“ پھرانھوں نے اپنے مطالبہ کی وجوہات بیان کیں تو آپ نے دعاکی اللہ نے قبول فرمائی مگرنافرمانوں کے لئے وعید بھی سنادی۔ حواری یہ وعید سن کر مرعوب ہو گئےاور آئندہ ایسے سوال سے باز رہے۔ قرآن مجید میں یہ مذکور نہیں کہ مائدہ اترا یانہیں اور اتراتھاتو کیاتھا۔ (یہودیوں کے من وسلویٰ کی طرح مائدہ کی تفصیلات نہیں ہیں) لیکن مفسّرین نے ”مائدہ“ کے ضمن میں ایسی روایات بیان کردیں' جن سے بالعموم یہ مشہور ہوگیاکہ مائدہ آسمان سے اتراتھا' جس میں لذیذاور مرغن کھانے تھے۔ یہ روایت بھی بیان کی جاتی ہے (راوی حضرت سلمانؓ فارسی) کہ ”جب حضرت عیسٰیؑ نے خوان (مائدہ) کاسرپوش کھولاتواس میں مچھلی بھُنی ہوئی' روغن اس کے سرسے جاری اور سرہانے نمک' پاؤں کی طرف سرکہ' گرداگرد ہرقسم کے ساگ اور پانچ روٹیاں' ایک پر زیتون' دوسری پر شہد' تیسری پر گوشت بریاں' چوتھی پر مسکہ اور پانچویں پر پنیر تھا۔ تیرہ سو آدمیوں نے پیٹ بھر کر کھایا۔ پھر بھی وہ مچھلی ویسی ہی رکھی رہی“۔

نولڈیکے نے انہی روایات کو متن کلام مجید میں شامل سمجھ کراعتراض کیاہے لیکن ان سب کاماخذروایاتِ اہلِ کتاب ہیں اوراسی لئےان کا شمار اسرائیلیات میں کیاجاتاہے۔ اس کے علاوہ ان روایات کی تائیدانجیل مرقس کے باب۶کی آیات ۳۵تا۴۴سے بھی ہوتی

ہے۔ پھر اسی انجیل کے باب ۸ میں بھی اسی طرح کی روایت ہے، جن کا یہاں نقل باعثِ طوالت ہو گا۔ مہربان حضرات متعلقہ انجیل یا تاریخِ صحف سماوی دیکھ لیں۔

(ب) نولڈکے کا اعتراض یہ ہے کہ "قرآن کی ترتیب ناقص ہے۔ سلسلۂ کلام منتشر اور ادبی حیثیت سے ادنیٰ پایہ رکھتا ہے۔ سورۃ یوسف ہی کو لو جس میں ایک مسلسل قصہ بیان ہوا ہے۔ لیکن پھر بھی توریت کتاب پیدائش کے قصۂ یوسف کے مقابلہ میں پست نظر آتا ہے"۔

(ا) قرآن کے ادبی محاسن پر کلام کرنا ممکن ہی نہیں اس لئے کہ قرآن کو ادب کے معیاروں پر پرکھنا ادب سے کور ذوقی ہے۔ بلکہ ادب کے معیار قرآن مجید کے انداز اور طرزِ بیان سے قائم ہوئے ہیں۔ اس سلسلے میں قرآن کا خود دعویٰ ہے۔ وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۔ (اگر تم میں سے کسی کو اس قرآن میں کسی قسم کا (ادبی، تاریخی وغیرہ) شک ہے تو اس کے (انداز بیاں اور طرز ادا) مقابلہ میں صرف ایک سورۃ (سب سے چھوٹی الکوثر۔۳ آیات) بنا لاؤ[1]۔ مگر عربوں کا فصیح اور قادر الکلام ہونے کے باوجود اس دعویٰ کے جواب میں آج تک ایک لفظ بھی پیش نہ کر سکنا اور اس کی ادبی حیثیت پر انگلی نہ رکھ سکنا اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ ایک اعلیٰ پائے کی ادبی کتاب ہے۔

سید قطب شہید "التصویر الفنی فی القرآن" میں رقمطراز ہیں کہ "واقعہ نگاری کے دینی مقاصد فنی حسن و جمال کے جن طریقوں سے پورے ہوتے ہیں وہ طریقے چار ہیں۔

(ا) **طرزِ بیان کا تنوّع**..... اس سلسلے میں کبھی کبھی ایسے ہوتا ہے کہ پہلے واقعہ کا خلاصہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ پھر تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ بعض دفعہ کسی واقعہ کا انجام اور نتیجہ بیان کر دیا جاتا ہے۔ پھر تفصیلات سے آگاہ کیا جاتا ہے۔ بعض اوقات واقعہ کو بلا تمہید ذکر کر دیا جاتا ہے۔ اور تفصیلات کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی جاتی۔ کبھی کبھی واقعہ کو افسانوی رنگ دیا جاتا ہے۔ چند الفاظ ذکر کیے جاتے ہیں جو آغازِ واقعہ کی جانب اشارہ کرتے ہیں پھر واقعہ خود بخود ہیرو کی زبان سے اگلوایا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں ان تمام اقسام کا بیان ہے۔

---

[1] البقرۃ: ۲۳

© rasailojaraid.com

اول کے لئے سورۃ الکھف ۹ ۔۱۲، دوم کے لئے القصص ۲ ۔ ۶ ' یوسف ۴ ۔ ۶ ' سوم کے ضمن میں ولادتِ عیسیٰؑ کے سلسلہ میں حضرت مریم کا واقعہ اور آخری خصوصیت کے لئے سورۃ البقرہ ۔۱۲۷ وغیرہ ملاحظہ فرمائی جائیں۔

(۲) طریقِ مفاجات کا تنوّع ...... بعض اوقات واقعہ کی حقیقت کا ہیرو کو علم ہوتا ہے. نہ ناظرین کو۔ پھر یکایک اس کا انکشاف کر دیا جاتا ہے۔ بعض دفعہ ناظرین کو تو اصلی راز سے آگاہ کر دیا جاتا ہے، مگر واقعہ کے ہیرو اور کردار اصلیّت سے بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ کبھی کبھی ناظرین کو واقعہ کے ایک حصہ سے آگاہ کر دیا جاتا ہے، مگر واقعہ کا مرکزی کردار اس سے آشنا نہیں کیا جاتا۔ اور ایک حصہ سے ناظرین اور ہیرو دونوں بے خبر رکھے جاتے ہیں۔ قرآن مجید میں تینوں قسم کی مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اوّل کے لئے دیکھو قصہ موسیٰؑ و خضرؑ (سورۃ الکھف) دوئم کے لئے القلم ۱۷ تا ۲۰ ' ۲۱ تا ۲۵۔ سوئم کے لئے تختِ بلقیس کا واقعہ ملاحظہ فرمائیے[1]۔ بعض دفعہ ہیرو اور ناظرین دونوں کو واقعہ کی تفصیلات سے بیک وقت آگاہ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید کی سورۃ مریم میں ولادتِ مسیح کا واقعہ اس ضمن میں ملاحظہ فرمائیے۔

(۳) مناظر میں وقفہ ...... واقعہ نگاری کی تیسری خصوصیت وہ وقفہ اور خلاء ہے جو ایک منظر اور دوسرے منظر کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کی مثال حضرت یوسفؑ کا قصہ قرآن میں بیان کیا گیا ہے۔ یہ واقعہ اٹھائیس مناظر میں بیان کیا گیا ہے۔ ان مناظر میں بار بار وقفہ آتا ہے۔ جو کہ اس واقعہ کی ادبی خوبی کی عمدہ ترین مثال ہے۔ مزید بر آں ...... اصحاب کہف ' حضرت مریم اور حضرۃ سلیمان کے واقعات بھی اپنے اندر یہی ادبی خصوصیت رکھتے ہیں۔

(۴) منظر کشی ...... قرآن جو مشاہد و مناظر بھی پیش کرتا ہے۔ ان کی اس انداز سے منظر کشی کرتا ہے کہ اس کا سامع و ناظر اسے ماضی کا واقعہ سمجھ کر سنتا ہے۔ مگر حال کی تصویر سمجھ کر منظر کشی سے سبق حاصل کرتا ہے۔ الکھف ۱۳ ۔ ۱۶ ' الکھف ۱۷ ' ۱۸ ' ۱۹ ' ۲۰ ' ۲۱ ' ۲۲ ' ۲۳ ' ۲۴ ' ۲۵ ' ۲۶ ' ۲۷ ۔ اس خصوصیت کی عمدہ و بہترین مثالیں ہیں۔

قرآن میں جو آیات بظاہر مکرر نظر آتی ہیں ان میں خالصتاً ادبی دقائق اور نکات پائے جاتے ہیں۔ ہر تکرار میں کوئی ایسی بات ضرور پائی جاتی ہے جو دونوں (تکراروں) کے مابین

---

[1] النمل : ۳۸ تا ۴۲

.com